'کسی باضمیر شخص کو مذہب کی کیا ضرورت ہے'

محمد مظاہر سے خالد سہیل کا انٹرویو

خالد سہیل: مظاہر صاحب میرے لیے یہ بہت خوش قسمتی کی بات ہے کہ نہ صرف آپ سے ملاقات ہوئی بلکہ موقع ملا کہ میں آپ سے کچھ مکالمہ کر سکوں۔

محمد مظاہر: جناب شکر گزار تو میں ہوں کہ آپ اتنا طویل سفر طے کر کے کینیڈا سے مجھ سے ملنے جنوبی افریقہ آئے اور یہ ایک اور عزت بخش رہے ہیں کہ میرا انٹرویو لے رہے ہیں۔

خالد سہیل: آپ کا غائبانہ تعارف تو زہرا نقوی کے حوالے سے ہوا تھا اور معلوم ہوا تھا کہ آپ نے جارج اورول کی کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے ہیں۔ انہیں پڑھ کر میرے ذہن میں جو آپ کا تاثر بنا ہے وہ ایک روایت شکن کا ہے۔ کیا آپ میرے اس تاثر سے اتفاق کرتے ہیں۔

محمد مظاہر: ممکن ہے اس میں کچھ میرے ارادے کا دخل ہو اور کچھ حالات کا۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ میں معالات کی تہہ تک' اگر وہ ذاتی مسائل نہ ہوں' بہت جلد پہنچ جاتا ہوں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ مجھے روایت شکن کہہ رہے ہیں۔

خالد سہیل: میں نفسیاتی حوالے سے متجسس ہوں کہ جو شخص روایت شکن بنتا ہے وہ کن حالات اور روایات کی وجہ سے بنتا ہے۔ آپ کی تربیت کس قسم کے خاندان اور ماحول میں ہوئی؟

محمد مظاہر: یہ طویل کہانی ہے اور کوئی ساٹھ برس سے زیادہ کی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں کسی شدید مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا لیکن یہ حقیقت ہے ہمارے بابا کافی مذہبی آدمی تھے۔ مگر غالباً سن ۱۹۸۰ء تک پاکستان میں مذہب کا اتنا زور نہیں تھا جتنا اب ہم دیکھ رہے ہیں۔ مذہب تو موجود تھا مگر لوگوں کا اوڑھنا بچھونا نہیں تھا بلکہ کچھ خاص ایام ہوتے تھے جس میں عموماً لوگ مذہبی تہواروں میں مصروف دکھائی دیتے تھے اور اس کے بعد لوگ قہقہے لگاتے اور زندگی سے اپنی ناخوشی کے باوجود لطف اندوز ہوتے دکھائی دیتے تھے۔

خالد سہیل: آپ کے ذہن میں بچپن کی کس قسم کی یادیں ہیں؟ والدین کے حوالے سے اور اسکول کے حوالے سے؟

محمد مظاہر: انڈیا کے گاؤں میں جہاں میں گنگا کے کنارے پیدا ہوا وہاں ایک اسکول تھا وہاں مجھے داخل کر دیا گیا۔ پہلے ہی دن میں نے آ کر کہا کہ وہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ ہو سکتا ہے میرے ذہن میں کوئی کجی ہو جس کی وجہ سے میرے ذہن میں ایسے خیالات پیدا ہوتے ہوں۔ اس کے بعد جب مجھے قرآن شریف پڑھنے کے لئے مدرسے بھیجا گیا تو مجھے بڑا ہی عجیب لگا۔ میں کوئی تیس سال کا ہوں گا جب میں نے قرآن شریف مکمل کیا۔ ویسے بھی اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو بتاؤں کہ میری Growth یا ترقی کوئی راتوں رات نہیں ہوئی بہت ہی سست اور

بیوقوفی کی حد تک میں قدامت پسند تھا اور یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں اشیاء کو سمجھ سکتا تھا۔

خالد سہیل: کیا آپ کے خاندان میں کوئی ایسی شخصیت تھی جس کا اثر آپ کی شخصیت پر زیادہ رہا ہو؟

محمد مظاہر: جی ہاں میری پھوپھی کے میاں تھے۔ان کا نام وحید الحسن تھا اور انہوں نے علیگڑھ یونیورسٹی سے ۱۲-۱۹۱۱ء میں گریجویشن کیا تھا۔وہ بہت ہی مذہبی آدمی تھے لیکن کتابیں بہت پڑھتے تھے۔جب میں انٹرمیڈیٹ میں تھا تو وہ میری کتاب رات کے کھانے کے بعد مانگتے اور صبح پڑھ کر لوٹا دیتے۔وہ فارسی، عربی اور انگریزی تینوں زبانیں جانتے تھے۔ان کے لباس اور اس کی تراش خراش پر وکٹورین تہذیب کے اثرات نظر آتے تھے۔وہ شہر میں کافی معروف بھی تھے مگر نماز و ماز پڑھنے میں کئی گھنٹے لگاتے تھے۔وہ چار پانچ گھنٹے تک نماز پڑھتے رہتے تھے میں نے ایک دفعہ ان سے پوچھا کہ آپ نماز پڑھنے میں اتنی دیر کیوں لگاتے ہیں تو کہنے لگے 'یار مجھے قرآن کی آیتیں یاد نہیں رہتیں اسلئے میں آہستہ آہستہ پڑھتا ہوں'

خالد سہیل: کیا آپ کی زندگی میں کوئی ایسا دور تھا جب آپ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اور مذہبی اقدار کو مانتے تھے؟

محمد مظاہر: نماز کبھی پابندی سے ادا نہیں کی۔روزے بھی کبھی رمضان کے پورے تیس نہیں رکھے۔مطلب یہ ہے کہ ہمیں بعض بار شک رہتا تھا کہ یار یہ ہم سب کچھ اصل میں کیوں کر رہے ہیں۔اگر کیا بھی تو بیچ بیچ میں ہم داؤ پیچ کر دیتے تھے۔عبادت میں صوم وصلواۃ کے معاملے میں ویسے بھی ہم ڈرپوک آدمی تھے کیونکہ کسی سے براہ راست ٹکر لینے کی ہمت نہیں تھی۔

خالد سہیل: کیا آپ کو یاد ہے کہ پہلی بار آپ نے اپنے دلی شکوک وشبہات کا اظہار کب اور کیسے کیا؟

محمد مظاہر: دیکھئے ہوتا یہ ہے کہ چیلنج آدمی اس وقت کرتا ہے جب اس کو دبا دیا جائے۔ایسی حالت میں ظاہر ہے وہ ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔آپ کسی کو دریا میں پھینک دیں تو وہ بچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے گا تو ہمارے یہاں جو سب سے بڑا مشغلہ تھا وہ 'فی' نکالنے کا تھا کہ ریاض کے ابا جو ہیں یا کریم کے ابا جو ہیں ان کی نسل ٹھیک نہیں ہے اور وہ مشکوک ذات کے ہیں۔اس کو اردو یا عربی میں کہتے ہیں 'فی' نکالنا۔تو یہ 'فی' نکالنا بڑا مشغلہ تھا میری یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آدم اور حوا کی اولاد میں کوئی خراب نسل کا کیسے ہو سکتا ہے یا اچھی نسل کا۔میں نے جب میٹرک پاس کر لیا تھا تب بھی میں لوگوں سے بحث کرتا رہتا تھا کہ آدم اور حوا کی اولاد میں بھی کوئی کم ذات یا بدذات یا عمدہ ذات کیسے ہو سکتا ہے؟ تو یہ میرا اپنے ماحول سے پہلا اعتراض یا سوال تھا۔میرے بابا یعنی میرے باپ نے تو ایک صاحب سے یہ تک کہہ دیا کہ یار ان کو سمجھاؤ یہ ذات پات کا نام نہ لیا کریں مگر ظاہر ہے کہ میں کیسے یہ بات مان لیتا۔

خالد سہیل: تو کیا آپ کا تعلق سید خاندان سے ہے؟

محمد مظاہر: جی ہاں۔شیعہ سادات گھرانے سے ہے۔اور ہم جس گاؤں کے رہنے والے ہیں اس کا نام بھی سادات ہے۔

خالد سہیل: جب آپ اسکول میں تھے تو آپ کا رجحان کس قسم کی تعلیم پر تھا کامرس فائن آرٹس یا سائنس؟

محمد مظاہر: میرا رجحان تو کسی طرف نہیں تھا مجھے اسکول بھیج دیا جاتا تھا اور وہاں میرا جی نہیں لگتا تھا یہاں تک کہ آٹھویں نویں دسویں میں بورڈ کے امتحان کے لئے اعتراض ہوا کہ ان کی حاضری کم ہے۔ کیونکہ میرا جی سکول میں نہیں لگتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں نہیں لگتا تھا۔ ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ میں نے ۱۹۴۸ء سے اخبار پڑھنا شروع کر دیا تھا اور ۱۹۵۲ء سے تو سمجھ بوجھ کر پڑھا۔ لائبریری سے لے کر بھی پڑھا۔ اور الا بلا کتابیں بھی پڑھتا تھا۔ نہیں پڑھتا تھا تو نصاب کی کتابیں نہیں پڑھتا تھا۔

خالد سہیل: اور یہ کتابوں اور اخباروں سے تعارف آپ کا اپنے شوق سے ہوا یا کسی نے اس سے متعارف کروایا؟

محمد مظاہر: اس میں کسی کا ہاتھ نہیں تھا۔ کرکٹ تو ہمارے ایک کزن نے سکھانے کی کوشش کی مگر کتاب سے لگاؤ خود ہمارا ہی شوق ہے۔ یہ خود ہماری ہی کمزوری تھی۔

خالد سہیل: آپ نے جب کتابیں پڑھنی شروع کیں تو شروع میں آپ صرف اردو کی مقامی تخلیقات پڑھتے تھے یا بین الاقوامی تخلیقات کے تراجم بھی پڑھتے تھے؟

محمد مظاہر: میں اردو کے ساتھ انگریزی اخبار بھی پڑھتا تھا۔ کرکٹ کی وجہ سے انگریزی اخبار کافی غور سے پڑھتا تھا لیکن ۱۹۶۰ء میں میٹرک پاس کر لینے کے بعد کچھ انگریزی کتابیں بھی میرے ہاتھ لگیں جو کتاب مجھے یاد رہ گئی وہ Burmies Days ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو میں نے ۱۹۶۳ء میں پڑھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ ۴۰ سال بعد میں برما چلا گیا اور وہاں کئی سال مقیم رہا۔

خالد سہیل: آپ کی نظریاتی تربیت میں کن ادیبوں نے خاص اثر ڈالا؟

محمد مظاہر: میں لوگوں کو اس کا کریڈٹ نہیں دے سکتا میں نے جیسے بتایا ۱۹۵۲ء سے میں اخبار پڑھتا تھا۔ ماؤ کی تحریک جسے شاید لوگ بھول بھال گئے ہیں مجھے اس نے کافی متاثر کیا یا فلپائن میں جو لڑائیاں ہو رہی تھیں، یا ملائیشیا اور سنگاپور کے جھگڑے یا جنوبی افریقہ کے ہجرت کے مسائل یا سویٹو میں گولی چل گئی وغیرہ وغیرہ تو یہ مجھے کافی دلچسپ لگتے تھے۔ خیر نتیجہ تو نہیں نکالتا تھا مگر دلچسپی رہتی تھی کہ ساری دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

خالد سہیل: کیا آپ کا کسی خاص مکتب فکر سے یا کسی آئیڈیالوجی سے تعلق رہا؟

محمد مظاہر: بالکل نہیں۔ ایسا تعلق تو نہیں رہا مگر یہ جاننا ضرور تھا کہ میں ۱۹۶۷ء میں کراچی میں ایوب خان کے مارشل لاء کے خلاف طالب علموں نے حصہ لیا۔ میں نے کبھی عملی طور پر حصہ تو نہیں لیا مگر مجھے یہ پتہ ہوتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ لوگ کہاں کہاں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور کن مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔ یہ ضرور تھا کہ میں باخبر رہتا تھا۔

خالد سہیل: اس وقت پاکستان کی کیا سیاست تھی سنا ہے ایوب خان کے زمانے میں کمیونسٹ نظریات کو دبایا گیا تھا اور سوشلسٹ ادیب زیر زمین چلے گئے تھے؟

محمد مظاہر: یہ تو ایوب خان کے آنے سے پہلے ہی روپوش ہو گئے تھے۔ ان میں بڑے بڑے نام تھے جو آپ سب کو معلوم ہی ہیں۔ ایوب خان نے تو اس تسلسل کو جاری رکھا۔

خالد سہیل: آپ کا لیفٹ ونگ کی پولیٹکس اور وہ ادیب جن کا ترقی پسند تحریک سے تعلق تھا ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

محمد مظاہر: سعادت حسن منٹو تو بائیں بازو کی تحریک کے سمجھے ہی نہیں جاتے تھے جب ان پر مقدمہ چلنے والا تھا تو مجھے سرسری یاد بھی ہے لیکن تفاصیل یاد نہیں۔ احمد ندیم قاسمی صاحب بھی پابند سلاسل رہے۔ فیض صاحب نے بڑی تکلیف اٹھائی۔ سبط حسن صاحب نے بھی مشکلات دیکھیں۔ حسن ناصر کی گرفتاری اور قتل ہونا اور آخر میں ضیاء الحق کے زمانے میں عبّاسی کا مارا جانا بھی اسی کڑی کا حصہ ہے۔

خالد سہیل: لیکن ان تمام لوگوں کا آپ کے ساتھ لگاؤ کس طرح کا رہا؟

محمد مظاہر: ذاتی طور پر ان لوگوں سے نہ ملا ہوں اور نہ میری ذاتی دوستی تھی۔

خالد سہیل: اس دور میں کوئی آپ سے پوچھتا کہ مظاہر صاحب آپ کا فلسفہ حیات کیا ہے بعض لوگ اپنے آپ کو کہتے ہیں مسلمان ہیں بعض کہتے ہیں سوشلسٹ ہیں لوگ مختلف نظریات سے اپنے آپ کو وابستہ کرتے ہیں۔ اگر یہ سوال کوئی آپ سے پوچھتا تو آپ کا کیا جواب ہوتا

محمد مظاہر: یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی قومیت پوچھے کہ آپ کون ہیں تو کہوں گا پاکستانی ہوں۔۔ حالانکہ کئی مقامات پر لوگوں سے کہا ہے کہ بھئی میں پاکستانی نہیں ہوں میرے پاس پاکستانی پاسپورٹ ہے۔ اسی صورت سے مذہب کا معاملہ ہے کہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کب مجھے بتانا پڑا کہ میں مسلمان ہوں۔ مجبوری تھی بتانا تو بتایا کہ میں مسلمان ہوں۔ کیونکہ اگر نہ کہوں مسلمان ہوں تو میری کوئی حیثیت ہی نہیں رہ جاتی ۔بحیثیت انسان کے بھی۔ کیونکہ پاکستان میں ہر شخص انسان بعد میں ہے اور اس کو مذہب کے پس منظر میں پہلے جانا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تو میں اس وقت بہت ناراض تھا۔ بھٹو صاحب نے اس سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی وہ کافی افسوس ناک واقعہ تھا۔

خالد سہیل: میں یہی جاننا چاہتا ہوں کہ اکثر بچے جس ماحول میں پلتے بڑھتے ہیں اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ مذہب کے ساتھ اور نیشنل ازم کے ساتھ اپنے آپ کو ذہنی طور پر، نظریاتی طور پر یا سیاسی طور پر وابستہ کر لیتے ہیں۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ آپ کی وابستگی ان دونوں نظریات کے ساتھ نہیں تھی۔ جس طرح ایک عام نوجوان کی ہوتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

محمد مظاہر: یہ جب پاکستان بنا اور ہمارا جو نصاب بنا اس میں رام چندر جی کا بھی ذکر تھا اور ہندوؤں کا بھی، یہ کوئی ایک دن کی کہانی نہیں ہے ساٹھ برس کی کہانی ہے، بتدریج ہم نے اپنے نصاب کو یہاں تک پہنچایا ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے نصاب میں موسیقی بھی شامل تھی۔ اسی صورت سے ہماری جو دینیات کی کتابیں تھیں ان میں رسول اللہ کے زمانے میں جو دوسرے رسول موجود تھے ان کا بھی ذکر کیا جاتا تھا۔ آج جن نوجوانوں کی عمر تیس یا پینتیس سال ہے ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ سن ۲ ہجری میں دیگر رسول بھی حجاز میں موجود تھے۔ پاکستان میں یہ

تبدیلی آہستہ آہستہ آئی ہے راتوں رات کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

خالد سہیل: کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ جو دینیات کا مضمون تھا وہ آہستہ آہستہ اسلامیات میں تبدیل ہو گیا؟

محمد مظاہر: آپ کی بات کافی صحیح ہے مگر اس کو یوں آپ پھیلائیں کہ پاکستانیت اور دینیات صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں پھیل چکی ہے۔ ہر Nation State کا یہ عارضہ ہے کہ بغیر مذہب کی بیساکھی کے یہ چل نہیں سکتی تو حقیقت یہ ہے کہ پاکستان بننے کے ساتھ یہ اچانک نہیں ہو گیا ۱۹۵۲ء میں کھوکھراپار کا راستہ بند کر دیا گیا' اس کے بعد سن ۱۹۶۲ء میں عائلی قوانین بنائے گئے' عائلی قوانین اس لئے بنائے گئے تا کہ اس سے قومی ریاست کو استحکام ملے اور آخر میں جب ۱۹۷۲ء میں قومی ریاست ڈوبنے لگی اور تمام کوششوں کے باوجود ڈھاکہ فال ہو گیا تو انہوں نے ۱۹۷۹ء میں حدود آرڈیننس بنا دیا۔ اور اسی صورت سے تاریخ اور مذہب میں وہ حصے مقبول کر دیے گئے یا نصاب میں شامل کر دئے گئے جس سے ایک نئی ریاست کو آکسیجن ملنے لگے' کیونکہ قومی ریاست کا مستقبل محفوظ نہیں تھا۔

خالد سہیل: آپ کا جو تصور نیشن اسٹیٹ کے بارے میں نوجوانی میں تھا کیا اس میں وقت کے ساتھ کوئی فرق آیا ہے؟

محمد مظاہر: میں نے جیسے پہلے عرض کیا کہ میری جو فہم و فراست یا سوجھ بوجھ بھی ہے وہ بہت ہی پیچیدہ مراحل سے گزری اور میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے اندر یہ کون ساجذبہ ہے جو مجھے راستہ دکھا دیتا ہے تو ۷۲' ۷۳ء کے بعد نیشن اسٹیٹ میرے نزدیک ایک غیر محفوظ اور مشکوک چیز ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب سے یورپی یونین ملک ایک ہو گئے ہیں یکم مئی ۲۰۰۴ء کے بعد تو یہ بات اور یقینی ہو گئی ہے۔

خالد سہیل: آپ کو اگر مختلف ممالک کو سیاسی مشورے دینے کا اختیار ہو جائے تو نیشن اسٹیٹ کی آلٹرنیٹ alternate کیا نظام آپ کے ذہن میں ہے؟

محمد مظاہر: یہ بہت سادہ سی بات ہے۔ ہمارے دو مسائل ہیں ایک نیشن اسٹیٹ ہے جس کی وجہ سے دنیا ۲۰۰ سے زیادہ خطوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ اس تقسیم سے فوجی صنعت کو فروغ مل رہا ہے' دشمنیوں کو فروغ مل رہا ہے اور لوگوں میں حد بندی بڑھائی گئی ہے۔ میں تو یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ بھئی آپ نیشن اسٹیٹ ختم کر دیں جس سے تین سال پرانے جو اعداد ہیں کہ ۵۰ ٹریلین ڈالر بچ جائیں گے اور میرے حساب سے میری دنیا میں ہر شخص کی آمدنی ۷۰۰۰ پاکستانی روپے فی کس بڑھ جائے گی باقی تو اور بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

خالد سہیل: مذہب کا ادارے کے بارے میں کیا رائے ہے؟

محمد مظاہر: مذہب کا میں نے عرض کیا کہ جیسے انسان دو ٹانگوں پر چلتا ہے اس صورت گورنمنٹ یعنی پولیس' فوج' عدالت ہے جیل ہے اسی صورت سے مذہب دوسری ٹانگ ہے یا آپ یوں سمجھیں انسان کے دو شانے ہیں ایک شانے پر گورنمنٹ اور دوسرے پر مذہب بیٹھا ہوا ہے۔ اور ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور اس سے سب سے زیادہ استحکام اس ادارے سے مل رہا ہے جس کا نام نکاح ہے۔ شاید اپنی بات صاف نہیں کر سکا۔

خالد سہیل: اس کی ذرا وضاحت کریں؟

محمد مظاہر: دیکھئے نیشن اسٹیٹ کو دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک تو یہ پانچ معروف ادارے جن کو آپ نے سن ہی لیا دوسرا ہے مذہب میں یہاں صرف اسلام کی بات نہیں کر رہا دنیا کے جتنے مذاہب ہیں ان سب کا جو انحصار ہے اسے جس سے تقویت ملتی ہے وہ نکاح ہے. نکاح سے مذہب کو تقویت ملتی ہے اور نیشن اسٹیٹ کو مذہب سے وہ اس طرح کہ اس کو اپنی فوج اور پولیس میں بھرتی کرنے کے لئے چارہ نکاح سے حاصل کرنا ہوتا ہے. جیسے ہی قومی ریاست بننے لگتی ہے وہ پہلے نکاح کو فروغ دیتی ہے اور اس کو اپنے قبضے' تسلط اور دسترس میں لے لیتی ہے تو اگر یہ خواتین فوج اور پولیس کے لئے چارہ بنانا بند کر دیں تو ظاہر ہے نیشن اسٹیٹ ختم ہو جائے گی.

خالد سہیل: اگر آپ کا یہ تصور تھا تو آپ شادی نہ کرتے؟

محمد مظاہر: آپ نے بالکل صحیح بات کی میرے لئے دو مسائل تھے ایک تو غربت دوسرا اس وقت مجھ میں اتنی اخلاقی جرات نہیں تھی دیکھئے فضا میں اتنی پولوشن پھیلی ہوئی ہے لیکن آپ سانس لے رہے ہیں میں اپنی بزدلی نہیں چھپا رہا بلکہ بتا رہا ہوں کچھ مجبوریاں ایسی ہیں جس میں آپ کو جینا ہے۔ یہ دنیا میں اتنی موٹریں ہیں اور گرین ہاؤس کو 250% نقصان انہیں سے پہنچ رہا ہے. کوئی دو کروڑ بیرل پیٹرول روز جلایا جاتا ہے اس سے پوری بنی نوع انسان خطرے میں ہے. اس پر کسی اخبار ریڈیو ٹی وی نے کوئی بات کہی؟ نہیں کہی جس کی سب سے بڑی ذمہ دار (contributer) وہ آٹو انڈسٹری ہے اس لئے آپ نے جو شادی کی بات کی میں اپنی مجبوری بتا رہا ہوں.

سہیل: آپ کی شادی آپ کی پسند کی تھی یا خاندان کی ارینجڈ شادی arranged marriage تھی؟

محمد مظاہر: کیوں کہ ہر آدمی کو شادی کرنی ہے تو کہیں میری شادی ہو جاتی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کبھی اس میں ناک بھوں نہیں چڑھائی کہ یہ یہاں کر دو یا وہاں کر دو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں.

سہیل: جب آپ کے بچے ہوئے تو باپ بننے کا آپ کا تجربہ کیسا تھا؟

محمد مظاہر: باپ بننے کا تجربہ جناب بالکل inpersonal ہے. جیسے ہاکی اور کرکٹ کے میچ میں آپ دور سے بیٹھ کر تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میرا تو اس میں کچھ بھی ہاتھ نہیں تھا۔ مرد ایسا ہے کہ نہ وہ نرسنگ کر سکتا ہے نہ وہ علاج معالجہ کر سکتا ہے الا ماشا اللہ کوئی مرد نکل جائے جو بہت ہی لائق ہو۔ میرا تو یہی خیال ہے ویسے جب بچے بڑے ہو گئے تو دلچسپی پیدا ہو گئی.

سہیل: میری جو آپ کی بچیوں سے ملاقات ہوئی تو ان کی باتوں سے احساس ہوا کہ ان کا آپ کے ساتھ ایک نہایت ہی جذباتی قربت' محبت اور پیار کا رشتہ ہے۔

محمد مظاہر: آپ کی بہت مہربانی آپ کا مشاہدہ درست ہے۔ اب وہ بچے تھوڑے ہی ہیں وہ ہمارے برابر کے ہیں بلکہ ان کی باتیں ہم بہت غور سے سنتے ہیں۔ ہم نے کبھی کسی بچے سے کبھی یہ بات نہیں کی کہ یہ بات تم نے کیوں پوچھی مجھ میں بڑی خرابیاں اور کمزوریاں ہیں لیکن کسی

کو یہ نہیں میں نے موقع دیا کہ میں کہوں کہ یہ بات کیوں کہی۔ اگر مجھے جواب نہیں معلوم ہوتا تو میں ان کو کوئی اور راستہ سجھا دیتا ہوں۔ ایک واقعہ سناتا ہوں میری بڑی لڑکی نے پوچھا ایک دن ابو اللہ تعالی کیا ہے؟ میں جھوٹ تو نہیں بول سکتا تھا اور سچ بھی نہیں بتا سکتا تھا تو میں اس کو لے گیا اپنے باپ کے پاس اور کہا ان کو بتائیں اللہ تعالی کیا چیز ہے میں آج بھی آپ کے سامنے دیانت داری سے بتا دوں کہ میں نے جھوٹ نہیں بولا کچھ بھی کہہ سکتا تھا ابا مگر میں نے کچھ نہیں کہا سوچا یہ خود بڑی ہو کر سمجھ لے گی.

سہیل: ان باتوں سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی ریاست یا مذہب کے ساتھ آپ کی commitment نہیں رہی.

محمد مظاہر: یہ کافی حد تک درست ہے۔ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں مذہب کے بارے میں تو یہ کہتا ہوں بلکہ آپ سے پوچھ لیتا ہوں کہ مذہب کی انسان کو کیوں ضرورت ہے؟ یہ میں نے ہندوستان کے مدارس میں بھی کسی سے پوچھا تھا آپ سے بھی پوچھ لیتا ہوں کسی باضمیر شخص کو مذہب کی کیا ضرورت ہے؟ کوئی صاحب بتا دیں.

سہیل: جب میں اسطرح کی باتیں سنتا ہوں تو میرے ذہن میں جو الفاظ آتے ہیں ان میں ایک لفظ free thinker کا آتا ہے اور ایک Anarchist کا آتا ہے۔ کیا آپ کسی فلسفیانہ تحریک سے متاثر رہے ہیں؟

محمد مظاہر: جی میں مختلف تحریکوں سے متاثر رہا ہوں مگر مذہب کی وجہ سے نہیں بلکہ اس طرح سے کہ اکثریت کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہو رہا ہے متعدد دفعہ ٹھوکریں بھی کھائیں تو پتہ چلا جس کو ہم بہت فائدہ مند سود مند سمجھ رہے تھے وہ ویسی نہیں تھی۔

جب وہ کتاب Animal Farm چھپی تھی. اس وقت سرد جنگ اپنے شباب پر تھی۔ میرے ایک دوست نے ۱۹۸۵ء میں کہا کہ ایک امریکی بوئنگ طیارہ 749 ٹوکیو سے جا رہا تھا اسے روسی سرحد پر مار گرایا تھا' امریکی شرارت' مگر یہ سوال بڑی حیران کن تھی کہ اس میں ۲۹۹ معصوم مسافر بیٹھے تھے۔ سوال یہ تھا کہ سوویت یونین کی موجودگی میں ایسا کیوں ہوا۔ ۱۹۵۶ء کی بات ہے آپ تو بہت چھوٹے رہے ہوں گے ہنگری پر ٹینک چڑھا دیے گئے تھے۔ یہ بڑی بے چین کر دینے والی صورت حال تھی حالانکہ میں ۱۶ برس کا ہوں گا مگر سوال تھا کہ اتنے ہزار افراد کیوں مار ڈال دیئے گئے ۱۰۰% تو کسی چیز پر بھی ہمارا ایمان نہیں تھا مگر وقتاً فوقتاً حضرت ابراہیم کی طرح کبھی چاند بھلا لگتا تھا کبھی سورج بھلا لگتا تھا.

سہیل: جارج اورویل کی دو کتابوں کے ترجمے کی آپ کو Inspiration کیسے ہوئی؟

محمد مظاہر: Animal Farm پر تو بڑی سادہ سی بات ہے کہ سرد جنگ میں ہم براہ راست تو مبتلا نہیں تھے پاکستان کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ امریکی طیارہ U2 پشاور سے اڑا ماسکو پر سے گزر رہا تھا تو روسی طیاروں نے مار گرایا خروشیف نے کہا کہ ہم نے مار تو گرایا ہے مگر پشاور پر ہم نے لال پینسل سے لال نشان لگا دیا ہے. ہم ایٹم بم مار دیں گے اگر اب کوئی وہاں سے اڑا۔ جبکہ کشمیر میں ذوالفقار علی بھٹو کو بھی داخل نہیں ہونے دیا گیا. وہ بحیثیت وزیر خارجہ جانا چاہتے تھے۔ پاکستان سے سوویت یونین اور یونائیٹڈ اسٹیٹس کا بہت جھگڑا چل رہا تھا۔ سرد

جنگ میں تو یہ تک ہوا کہ ایٹم بم سیدھے کر لئے گئے تھے کہ ہم ایک دوسرے پر گرا دیں گے کیوں؟ یہ تو مجھ جیسے نہ سمجھ پائے۔ بہت سے باہوش لوگ ایسے بھی تھے جن کے لئے یہ تشویش کا باعث تھا۔

ان ہی دنوں میرے ایک دوست امریکہ سے یہ کتاب لائے تھے۔ مجھے پڑھنے کے لئے دی تو میں نے کہا یار میرا تو خیال ہے اس کا ترجمہ ہونا چاہیے انہوں نے کہا آپ کریں ہم آپ کی مدد کریں گے ترجمہ کیا ترجمہ چھپ گیا ترجمہ کرنے کے بعد پتا چلا کچھ لوگ پہلے بھی اس کو تختۂ مشق بنا چکے ہیں۔ میری کتاب پروڈکشن کے حساب سے تو بہت معمولی ہے لیکن ترجمہ میں نے پوری دیانت داری سے اور مقدور بھر ۱۰۰% صحیح کیا ہے۔

سہیل: وہ کتاب میں نے پڑھی ہے اور اس نے مجھے متاثر بھی بہت کیا۔ آپ کا یہ اردو ادب کو بہترین تحفہ ہے۔

مظاہر: دوسری کتاب جو ہے Homage to Catalonia اس لئے اس کا میں نے ترجمہ کیا یہ بات میرے دل میں کوئی ۱۲ برس سے تھی میرے دوست رحمٰن صاحب بڑے عالم فاضل تھے وہ بھی کہتے تھے اس کا ترجمہ کر دو ترجمہ کرنے کے بعد ۲۰۰۴ء میں ایک عجیب واقعہ ہوا میں کینیڈا میں تھا تو Times نے سو سالہ جارج اورول پر ایک صفحے کا انتہائی تحسین آمیز عالمانہ مضمون شائع کیا مگر نہایت کامیابی سے Homage to Catalonia کا ذکر نہیں کیا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان کی جو راست گفتاری ہے اس کے اندر کہیں کہیں چور چھپا ہوا ہے۔

سہیل: اسی کو کہتے ہیں It is conspicuous by its absense

مظاہر: آپ اس کو رعایتی نمبر دے دیں ایسا نہیں ہے کیونکہ Homage to Catalonia جو ہے وہ انسانیت کی ظلم اور استبداد کے خلاف جنگ ہے جس میں بدنصیبی سے انسانیت شکست کھا گئی مگر وہ معاملہ ختم نہیں ہوا آج بھی کوئی سات ماہ پہلے جنوری ۲۰۰۶ء میں اسپین کے ایک کمانڈر ان چیف کو نوکری سے برخاست کر دیا گیا اور جیل میں ڈال دیا گیا کہ جتنی ملازمت باقی ہے وہ جیل میں ہی گزارے اور جون یا جولائی ۲۰۰۶ء میں اسپین کی پارلیمنٹ نے فیصلہ کیا جس کے تحت سوائے ائیر ٹریول باقی تمام معاملات میں اسے مقامی خودمختاری دے دی گئی۔

سہیل: جب ہم آزادی کی جدوجہد کے بارے میں پڑھتے ہیں تو یہ تاثر ملتا ہے کہ ایک ریاست کے لوگ جن کو freedom fighter کہتے ہیں دوسری ریاست کے لوگ انہی کو تشدد پسند یا Terrorist کہتے ہیں اور بعض دفعہ ۳۰ یا ۴۰ سال بعد تاریخ دوبارہ لکھی جاتی ہے تو ایک نئی صورت حال سامنے آجاتی ہے آپ کا کسی بھی جنگِ آزادی کے بارے میں خاص کر جو Armed Struggle ہو اس کے بارے میں کیا تاثر ہے۔

مظاہر: آپ کا سوال بہت دلچسپ ہے اور اس کا جواب پچھلے ڈھائی سو برس ۱۷۸۰ء سے شروع کیا جا سکتا ہے۔ برطانوی تاریخ میں

درج ہے کہ جارج واشنگٹن ایک Terrorist دہشت گرد تھے ان کے علاوہ اور بھی کئی نام میں لے سکتا ہوں جنہوں نے بعد میں بڑا نام کمایا۔ یہ تو تاریخ فیصلہ کرتی ہے کہ کون دہشت گرد ہے اور کون نہیں. آج کل پروپیگنڈہ ہے ہم لوگ ایک دوسرے کو دہشت گرد ثابت کر دیتے ہیں تو اس میں کوئی بات معروضی نہیں کہی جا سکتی کہ کون دہشت گرد ہے کون نہیں لیکن یہ مجھے ضرور تھوڑا سا احساس ہے کہ دہشت گردی سے کوئی بہت بڑے مقاصد حاصل نہیں ہوتے اور دہشت گردی جیسی جارج واشنگٹن نے کی تو اس کے پیچھے نیشن اسٹیٹ nation state کا آئیڈیا تھا۔

سہیل: لیکن آپ تو نیشن اسٹیٹ کے حق میں نہیں ہیں ۔ جو آزادی کی تحریکیں ہیں ان کی بنیاد تو ایک سامراجی آمرانہ Colonial Imperialist طاقت کے خلاف قومی تحریکیں ہیں. چاہے انڈیا ہو کیوبا ہو یا اور کوئی ملک ہو تو وہ اپنی ایک آزاد ریاست بنانا چاہتے ہوں تو آپ تو چونکہ اسٹیٹ کے بھی حق میں نہیں ہیں تو آپ کی نگاہ میں آزادی کا تصور کیسا ہے؟

مظاہر: بہت سادہ سی بات ہے دیکھئے انسان افکار کے اوپر جیتا ہے کچھ افکار پوپ pop ہوتے ہیں اور کچھ کلاسیکل classical تو اس وقت بنی نوع انسان دو چیزوں میں گرفتا ہے نیشن اسٹیٹ اور دوسری چیز ہے سب نیشن اسٹیٹ sub-nation state جس کی نمائندہ بھارت میں سکھ تحریک ہے۔ یا Latin America میں چل رہی ہیں یا کئی اور ممالک میں یوگوسلاویا میں مارشل ٹیٹو کے جانے کے بعد ذیلی تحریکیں بھی چل رہی ہیں ۔ اس وقت دنیا میں تین طرح کی تحریکیں ایک ساتھ چل رہی ہیں ایک نیشن اسٹیٹ کی ایک ذیلی اسٹیٹ کی. پاکستان میں بھی ایک تحریک چل رہی ہے میں اس کا نام نہیں لینا چاہتا اور تیسری وہ ہے جو ان دونوں کے خلاف چل رہے ہے یعنی نیشن اسٹیٹ اور ذیلی ریاست دونوں سے انسان کی جان چھڑانے کے لئے چل رہی ہے. اس کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں.

سہیل: آپ کی نگاہ میں بعض مذہب کو بعض کلچر کو اور بعض زبان کو اپنی نئی ریاست یا ملک کا جواز پیش کرتے ہیں تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ تمام جواز کیا آپ کے لئے قابل قبول نہیں ہیں؟

مظاہر: دیکھئے جناب تاریخ کے مطالعے کے حد تک تو ان کو تاریخ میں شامل کیا جائے گا مگر ہر مذہب کی بنیاد دوسروں کو حقیر اور کمتر انسان بنانے پر قائم ہے. یہودی عیسائیوں کو غلط سمجھتے ہیں عیسائی مسلمانوں کو غلط سمجھتے ہیں مسلمان بدھ کو غلط سمجھتے ہیں بدھ ہندوؤں کو غلط سمجھتے ہیں حد تو یہ ہے کہ مذہب کے اندر بھی جو فرقے ہیں وہ ایک دوسرے کو غلط سمجھتے ہیں میں اس پر کوئی روشنی ڈالوں یہ نامناسب ہے.

سہیل: آپ نے ایک اور کتاب کا ذکر کیا جو ابھی سب کے سامنے نہیں آئی لیکن آپ اس کا مکمل ترجمہ کر چکے ہیں آپ نے کہا کہ آپ نے ایک ہزار صفحے کی کتاب مکمل کر لی ہے تو اس کے بارے میں کچھ بتائیے؟

مظاہر: یہ کتاب ۴ سال پہلے حادثاتی طور پر میرے ہاتھ چڑھ گئی ۔ میں امریکی تاریخ دان اور فلسفی ول ڈیوراں کی کتاب کا حوالہ دوں گا انہوں نے یہ بات کہی ہے کہ گذشتہ پچاس سال سے عورتوں کی تحریک بہت چل رہی ہے لیکن عورتوں کے پاس کوئی رول ماڈل نہیں ہے

سوائے اس عورت کے

سہیل: آپ نے ان کا نام اور کتاب کا نام نہیں بتایا.

مظاہر: وہ خاتون ۱۸۵۹ء میں جرمنی اور روس کے درمیان جو سرحد ہے اس پر پیدا ہوئی تھیں۔ ستم ظریفی یہ کہ وہ امریکہ چلی گئیں اور وہاں ۳۰ سال گزارنے کے بعد ان کو ملک بدر کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ یورپ میں سرگرم رہیں میں یہ نہیں بتانا چاہتا کہ وہ کیا کیا کرتی رہیں لیکن ان کا اثر و رسوخ ۱۹۳۰ء میں چین، جاپان اور آسٹریلیا میں بھی پہنچ چکا تھا۔ امریکہ میں ان کو کم از کم ۸ دفعہ جیل میں ڈالا گیا۔ اس کے بعد تنگ آ کر ان کو ملک بدر کر دیا گیا.

سہیل: ان کا اسم گرامی؟

مظاہر: ان کا نام ہے Emma Goldman اور وہ متعدد زبانیں جانتی تھیں جن میں فرنچ، روسی اور انگریزی بھی شامل تھی۔

سہیل: میرے ذہن میں یہ سوال بھی ہے کہ اکثر لوگ جو آپ کی طرح غیر روایتی سوچ اور شعور رکھتے ہیں ان کو اگر موقع ملے تو وہ یورپ یا شمالی امریکہ کی لبرل سوسائٹی میں آ جاتے ہیں تو میں سوچتا ہوں آپ جیسا شخص پاکستان میں رہے تو اس کی سماجی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں کس قسم کے مسائل کا سامنا کرنا ہوتا ہے جب آپ لوگوں کو چیلنج کرتے ہیں تو کیا ردِعمل ہوتا ہے؟

مظاہر: میں آپ کے سوال کا جواب صاف نہیں دوں گا لیکن میری پاکستان میں زیادہ ضرورت ہے.

سہیل: اب آپ اپنی بیگم کی وفات کے بعد زندگی کے نئے موڑ پر نئے دور میں داخل ہو رہے ہیں تو میں سوچتا ہوں کہ آپ کی تخلیقی طور پر یا سماجی طور پر خواہش کیا ہے کہ آپ اگلے چند سالوں میں کیا کریں گے؟

مظاہر: دیکھئے میں نے ۵۵، ۶۰ برس میں جو سیکھا ہے ظاہر ہے وہی صرف منتقل کر سکتا ہوں چاہے وہ تحریری صورت میں ہو یا تقریری صورت میں۔ اگر لوگ مجھے بلاتے ہیں ویسے مجھے تقریر کرنے کا شوق نہیں لیکن اگر لوگ کہتے ہیں تو میں غیر مقبول نظریات ان کو بے دھڑک بیان کر دیتا ہوں۔

سہیل: جب میں آپ کے تراجم پڑھ رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ جو مترجم ہے وہ چاند کی طرح سورج کی روشنی کو Reflect کرتا ہے لیکن آپ سے جو ملاقات ہوئی تو مجھے لگا کہ آپ بذات خود ایک سورج ہیں ایک دانشور ہیں ایک سوچ رکھتے ہیں تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ آپ کو اپنی زندگی کی کہانی اپنی سوانح لکھنی چاہئے۔ کیا آپ نے اس حوالے سے کبھی سنجیدگی سے سوچا؟

مظاہر: یہ آپ کے علاوہ دیگر دوست احباب نے بھی مجھ سے کہا اور میں نے اس پر کچھ چھوٹا موٹا ذہن میں خاکہ بنانے کی بھی کوشش کی لیکن پچھلے تین ماہ سے کاروبار رکا ہوا ہے۔ اگر صحت اور زندگی رہی تو میں کوشش کروں گا مگر ساری بات اس میں متنازعہ ہوں گی.

سہیل: مگر ایسی چیزیں کم لکھی جاتی ہیں

مظاہر: آپ صحیح کہہ رہے ہیں اردو زبان میں تو ویسے بھی کافی خلاء ہے' یادوں کی بارات' کے بعد تو کچھ آیا ہی نہیں۔

سہیل: اور آخر میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ اپنے پروفیشن کی وجہ سے بہت مسافت میں Travel میں Involve تھے تو دنیا کا آپ نے کافی سفر کیا ہے اس حوالے سے آپ کا کیا تاثر ہے جب آپ دنیا کے دوسرے حصوں سے واپس پاکستان آتے ہیں تو وہ تجربہ کیسا رہتا ہے؟

مظاہر: اگر آپ مجھ پر حب الوطنی کا لیبل نہ لگائیں تو میرے خیال میں پاکستان میں زندگی اچھی ہے چند ایک تکالیف کے باوجود اور پاکستان میں رہنے کا ایک اور اہم ترین فائدہ ہے کہ آپ کی دنیا بدلنے کی خواہش ہلکی نہیں پڑتی جتنی بھی وہاں پر دشواریاں مسائل اور تکالیف ہیں وہ زندگی کو بہتر بنانے پر اکساتی ہیں۔

سہیل: اگر چہ اس طرح مختصر انٹرویو میں ایک Over view ہی ہوسکتا تھا۔ کوئی ایسی چیز جو آپ کے ذہن میں ہو اور میں نے نہ پوچھی ہو وہ اگر آپ شیئر کرنا چاہتے ہوں یا کوئی سوال پوچھنا چاہتے ہیں؟

مظاہر: میرا خیال یہ ہے کہ دنیا میں سب سے اہم چیز جو ہے وہ انسان ہے۔ اور ہمیں خاص طور سے مشرق میں خواتین کو اہمیت دینی چاہیے آپ نے اتنے سوال ہم سے پوچھے ہم بھی آپ سے ایک سوال پوچھیں گی یہ ۵۴ سال میں اتنا سفر کر کے اور اتنے وطن اور شہر چھوڑنے کے بعد یہ ۴۰ کتابیں آپ نے کیسے لکھ دیں؟

سہیل: میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کے سامنے' آپ جیسے دانشور کے سامنے ایسی بات کروں مگر مجھے جوانی میں ہی یہ احساس ہو گیا تھا تخلیقی کام فل ٹائم جاب ہے' یہ شوق کا کام ہے' عشق کا کام ہے اور اس کام میں سب سے بڑی رکاوٹ شادی' بچے اور خاندانی ذمہ داریاں ہیں۔ میں نے خاندان بنانے سے احتراز کیا اس لئے مجھے تخلیقی کام کے لئے بہت سا وقت مل جاتا ہے۔ میرا پیشہ بھی میری مدد کرتا ہے۔ میرے کلینک کا نام بھی creative psychotherapy clinic ہے۔ چنانچہ کچھ تخلیقی کام کلینک میں کرتا ہوں اور کچھ فارغ وقت میں اور تخلیقی دوستوں کی قربت بھی اس سلسلے میں مدد کرتی ہے۔ ہم ہر اتوار 'درویشوں کے ڈیرے' پر جمع ہو جاتے ہیں اور تبادلہِ خیال کرتے ہیں وہ محفلیں مجھے بہت تحریک بخشتی ہیں۔ inspire کرتی ہیں۔ آخر میں میں آپ کا پھر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سے مکالمہ کرنا میرے لئے باعثِ فخر ہے۔

مظاہر: آپ کا بھی شکریہ۔